جناب احمد ندیم قاسمی

غالب کی حسرتِ تعمیر

آخر یہ کیا بات ہے کہ غالب اپنی "حسرتِ تعمیر" سے کہیں بھی دست کش نہیں ہوتا۔ وہ بظاہر آشوبِ موت اور آشوبِ روزگار کے سامنے جگہ جگہ سپر انداز نظر آتا ہے مگر اتنے شدید درد و کرب کے عالم میں بھی تعمیرِ نو کی حسرت اُسے زندہ رکھتی ہے۔ وہ تو اس حسرتِ تعمیر کو اپنا واحد اثاثہ قرار دیتا ہے:

ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ ۔۔۔ سوائے حسرتِ تعمیر، گھر میں خاک نہیں
گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اُسے غارت کرتا ۔۔۔ وہ جو ہم رکھتے تھے اک حسرتِ تعمیر، سو ہے

آخر وہ کیسی تعمیر چاہتا ہے؟ اُس زمانے میں جب سیاسی معیار، تہذیبی اقدار اور تمدنی روایات کھنڈروں میں بدل رہی تھیں، اگر غالب نے اپنے اندر حسرتِ تعمیر کو مرنے نہیں دیا، اگر اس سنسان اور بھیانک منظر میں بھی اس نے کامل قنوطیت اور مکمل کلّیت سے اپنی شخصیت کو محفوظ رکھا، اگر اس نے اپنی ذہانت اور ذکاوت کے ہتھیار سنبھالے رکھے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ غالب اس "ذات پرستی" سے بہت اونچا اُٹھ چکا تھا جو آج اس کے انتقال کے ایک صدی بعد بھی ہماری ذہین اور حساس نسل کا مسئلہ بنا ہوا ہے۔ غالب نے اپنی ذات کے آئینے میں پوری کائنات کا تماشا کیا۔ اس طرح اس کا کوئی بھی جذبہ مجروح نہ رہا۔ اس کا ہر جذبہ، ہر تجربہ، ہر خیال اپنے عصر سے وابستہ رہا۔ اس کا تصوّف، اس کا عشق، اس کی وسیع المشربی سب ایک آفتاب کی شعاعیں تھیں، اور یہ آفتاب خود غالب تھا۔ اس کی فنی شخصیت اور فکری انفرادیت اپنے عصر پر آسمان کی طرح چھائی رہتی تھی۔ وہ اپنی ذات کے خول میں محبوس نہیں تھا۔ اگر ایسا حادثہ ہو جاتا تو آنے والی نسلیں غالب کے ساتھ بھی یہی سلوک کرتیں کہ مومن اور ذوق کی صد سالہ برسیاں گزر بھی گئیں مگر اُردو لکھنے پڑھنے اور بولنے والوں کو کانوں کان پتہ بھی نہ چلا۔ اس صورت میں ہم غالب کو بھی اس کے دیگر معاصرین کی طرح کھو بیٹھتے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا کہ غالب کی غزل میں ہمیں میر کی ترقی یافتہ صورت نظر آجاتی اور بس۔ مگر غالب نے صرف اپنے کسی دُکھ کے ماتم کے لیے اپنے فن کو وقف نہیں کیا تھا۔ وہ اتنا باشعور تھا کہ یہ نکتہ کہنے کا

حوصلہ رکھتا تھا۔

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی　　وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے

اردو غزل اس عالی حوصلگی، اس وسیع القلبی، اس حقیقت بیانی، دل کے معاملات میں ذہن کی اس شمولیت کی عادی نہیں تھی۔ یہ غالب ہی کا اعجاز ہے کہ اردو غزل کو بے چارگی، قدریت اور عاجزانہ سپردگی کے مرض سے خلاصی دلائی اور زندگی کی ہمہ گیری کو عام کیا۔

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں　　تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

یہ بالکل نئی آواز تھی۔ اس آواز نے اردو غزل کی کلاسیکی روایت کے پرستاروں کو چونکایا اور اُن کا پہلا ردِّ عمل غالب کو مکمل طور پر رد کر دینے کی صورت میں ظاہر ہوا ــــ یہ پہلا ردِّ عمل قدرتی تھا۔ صدیوں کے معمولات پر یکایک ایک ضربِ کاری پڑے تو کون ہے جو ضرب لگانے والے کے خلاف چیخ نہیں اُٹھے گا۔

غالب کی یہی حسرتِ تعمیر ہے جو اسے پہلو دار اور تہ دار شاعر بناتی ہے۔ اگر وہ ماضی کی لاش پر سینہ کوبی ہی کو اپنا واحد منصب ٹھہرا لیتا تو ہم اس غالب سے محروم رہ جاتے جو آج ہمارے شعر و فن کا سرمایہ ہے۔ یقیناً وہ ماتم بھی کرتا ہے، روتا بھی ہے: ع

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں؟

انسان کی زندگی کے انجام پر حیرت زدہ بھی رہ جاتا ہے مگر وہ درد و کرب کے اس عالم میں بھی اپنے معاشرے کے دوسرے افراد سے اور ان کی خستگی سے کتراتا نہیں ہے۔ پھر وہ انسانی برادری سے اس وابستگی پہ باقاعدہ فخر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر　　نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے

خلقِ خدا سے اس روشناسی کی آواز غالب کے حوالے سے اردو شاعری میں پہلی بار سنائی دی ہے۔ یہ درست ہے کہ تصوّف کی برکت سے میر درد کہہ چکے تھے کہ:

کہاں ہیں آدمی عالم میں پیدا　　خدائی صدقے کی انسان پر سے

مگر غالب کی روشناسیِ خلق میں کوئی مابعد الطبیعیاتی عنصر نہیں ہے۔ یہاں غالب کے ٹھوس تجربے کی کارفرمائی نمایاں ہے اور اس تجربے نے یہ مثبت صورت اس لیے اختیار کی ہے کہ غالب

ایک ایسا شاعر تھا جس کے ہاں دل اور دماغ یا جذبہ اور ذہن یا خواب اور حقیقت کا ایک نہایت متوازن اور اسی لیے نہایت خوب صورت امتزاج موجود ہے۔ احساس و دانش کے اس متناسب امتزاج کی کوئی قابلِ ذکر مثال نہ غالب سے پہلے دستیاب ہوتی ہے، نہ آج تک کی اردو شاعری میں میسر آسکتی ہے۔ مانا کہ دل و دانش کے اس اتحاد کی مثالیں گزشتہ ایک صدی کی شاعری میں خاصی تعداد میں مل سکتی ہیں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ ان کی مثالوں میں کہیں دانش، دل پر مسلط نظر آتی ہے تو کہیں دل، دانش کو دبائے ہوتے ہے۔ اس اتحاد میں غالب کا سا حُسنِ توازن نایاب ہے۔ اس کا ایک سبب غالب کا اندازِ شعر گوئی بھی ہو سکتا ہے اور غالب کے سوا یہ اسلوب کسے نصیب ہوا ہے:

رونقِ ہستی ہے عشق کے خانہ ویراں ساز سے — انجمن بے شمع ہے اگر برق خرمن میں نہیں

ہنوز محرمیِ حُسن کو ترستا ہوں — کرے ہے ہر بُنِ مو کام چشمِ بینا کا

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی — چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

مجھے اب دیکھ کر ابرِ شفق آلودہ یاد آیا — کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستاں پر

کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے — کرے جو پرتوِ خورشید عالم شبنمستاں کا

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب — دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ اُلفتِ ہستی — عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

قلب و ذہن، جذبہ و دانش، داخلیت اور خارجیت کی اس یک جائی اور یک جانی کو اعجازِ فن کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے اور حق یہ ہے کہ یہی وہ رنگِ سخن ہے جس نے اُردو شاعری کو اس معراج تک پہنچایا جس پر وہ آج نظر آرہی ہے اور جسے ابھی اس سے بھی آگے جانا ہے۔ یہ بات میں نے خود اعتمادی کے ساتھ اس لیے کہی ہے کہ جس شاعری کے ایوان کی بنیاد غالب کے شعر و فن نے فراہم کی ہو، اس کی بلندی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہیں۔ حسرتِ تعمیر کے معاملے میں استقامت آخر کار تعمیر ہی کی صورت میں جلوہ گر ہو کر رہتی ہے۔

غالب کی غزل میں شاید اسی حسرتِ تعمیر سے چونک کر یار لوگ یہ کہتے سنے گئے ہیں کہ غالب عشق کی گداختگی سے محروم رہا۔ ان حضرات کی رائے کے مطابق عشق میں مجنون ہو جانا لازمی ہے ورنہ بصورتِ دیگر انسان کے اس شدید ترین جذبے کے ساتھ انصاف نہیں ہو سکتا۔ پھر غالب نہ فر

یہ کہ اپنی شخصیت کو کھنڈر بنانے پر تیار نہیں ہے بلکہ وہ تو اپنے ملبے میں تعمیرِ نو کے خواب دیکھتا ہے اور یہ تعمیر و ارتقا کے ٹنٹے مذہبِ عشق میں کفر کے مترادف ہیں۔ ایسی باتیں صرف ایسے لوگ ہی کر سکتے ہیں جو عشق کو زندگی سے بے تعلقی کا ایک عذر بنا لیتے ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ انسانی شخصیت انتہائی حد تک پہلو دار ہوتی ہے۔ عشق کا سا قدرتی اور بنیادی اور مقدس جذبہ انسان کی شخصیت کی تکمیل میں یقیناً کارگر ثابت ہوتا ہے لیکن اگر انسان صرف اس جذبے کا ہو کر رہ جائے تو یہ ایک خطرناک قسم کا فرار ہے۔ اپنی اس حد بندی سے شاعر اپنے قاری کے ذہن میں خستگی اور گداختگی تو پیدا کرے گا مگر بالیدگی اور ارتفاع پیدا نہیں کر سکے گا، اور اگر ہمیں کسی شاعری کے مطالعے سے ارتفاع محسوس نہیں ہوتا، اگر ہم یہ محسوس نہیں کرتے کہ ہماری شخصیت کی تہذیب ہو رہی ہے، اگر ہم اس احساس سے محروم رہتے ہیں کہ اگر ہم اپنی آنکھوں اور ذہن پر پٹی باندھ کر گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ آگے بڑھ گئے تو ہمارے آگے بڑھنے اور پیچھے ہٹنے میں کوئی فرق باقی نہیں رہ جائے گا، اور غالب نے کہا ہے کہ ع۔

چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا!

تو اس کا صاف و صریح مفہوم یہ ہے کہ ہم نے شعر نہیں پڑھا ہے، چرس کا ایک کش لگایا ہے۔ ہومر سے لے کر اقبال تک دنیا بھر میں جتنے بھی شاعر گزرے ہیں جن کے بارے میں ہم سب متفق ہیں کہ وہ آفاقی شاعر ہیں اور انسان کے جیتے جی مر نہیں سکتے، تو یہ سب غالب کے ذہن کے شاعر ہیں۔ ان کے ہاں عشق، کائنات اور حیاتِ انسانی کی بے شمار حقیقتوں اور صداقتوں سے مربوط ہے۔ غالب اسی عظیم جماعت کا ایک قد آور فرد ہے۔ عشق سے تلخی اور کلبیت کی بجائے اسے حسرتِ تعمیر ملی ہے۔ یا پھر زیادہ سے زیادہ بعض اسرارِ کائنات کے سلسلے میں وہ تحیّر کا اظہار کرتا ہے، مگر یہ منفعل قسم کا تحیّر ہے۔ یہی تحیّر تو اس کے ہاں تفتیش و انکشاف کی بنیاد ثابت ہوتا ہے۔ آپ کہیں گے یہ تو منطق ہے اور بات تو شاعری کی ہو رہی ہے۔ مگر شاعری کی بھی ایک منطق ہوتی ہے۔ یہی منطق (غالب کے مندرجہ صدر اشعار کے حوالے سے) خرمن و برق اور انجمن و شمع میں رشتے تلاش کرتی ہے۔ یہی منطق حسن سے شناسائی کی خاطر ہر بُن مُو سے چشمِ بینا کا کام لینے پر مجبور کرتی ہے۔ اسی کے دم سے چمن، آئینۂ بادِ بہاری کا زنگار بنتا ہے اور یوں لطافت جلوہ آرائی کے قابل ہو جاتی ہے۔ یہی شاعرانہ منطق، یہی دل و دماغ کی

یک جائی وہ عظیم شاعری پیدا کرتی ہے جس کی ایک بڑی مثال غالب کی شاعری ہے۔ غالب کو زندہ رہنے کے لیے قدرت نے وہ دَور دیا جب ایک عظیم تہذیب کی عمارت کو شور چاٹے جا رہا تھا اور جب ساتھ ہی ان کھنڈروں کے پہلو میں ایک اور تہذیب کی بنیادیں ڈالی جا رہی تھیں۔ غالب کی جگہ کوئی اور شاعر ہوتا تو ساری زندگی شہر آشوب ہی لکھتا رہتا اور اپنی نہایت پیاری قدروں اور روایتوں کی کچلی ہوئی میتوں پر عمر بھر سینہ زن رہتا۔ سینہ زنی اس نے بھی یقیناً کی، کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو ہم اسے بے حس ٹھہراتے۔ اس نے سینہ زنی کی تو یہ انسانی فطرت کا تقاضا تھا۔ مگر انسانی فطرت کا تقاضا یہ بھی تو ہے کہ وہ گرتا ہے تو اٹھ بھی کھڑا ہوتا ہے۔ اس نے شکست پر ماتم ضرور کیا ہے مگر شکست کو تسلیم کبھی نہیں کیا۔ اگر انسان شکست تسلیم کر لینے کا عادی ہوتا تو عالمِ انسانیت بیسویں صدی میں بھی ہزاروں صدیوں پہلے کی دنیاؤں میں بھٹک رہا ہوتا۔ چنانچہ غالب نے آشوب کی انتہا میں بھی حسرتِ تعمیر سے دست کشی اختیار نہ کی اور نغمہ زن رہا:

مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند
شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند

ارمغانِ شاہ ولی اللہؒ

(مرتبہ: محمد سرور)

حضرت شاہ ولی اللہ نے جملہ علوم دینی کو حکمت کے عقلی اصولوں پر مرتب فرمایا اور اپنی تصانیف میں علوم تفسیر و حدیث و فقہ و تصوف کا جائزہ لیا ہے۔ آپ نے ملت کی سیاسی تاریخ کا بھی تجزیہ کیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ شریعت کے جتنے بھی احکام ہیں، ان سب میں حکمتیں اور مصلحتیں ہیں۔ "ارمغانِ شاہ ولی اللہ" میں شاہ صاحب کی ان ہی تعلیمات و افکار کو مرتب کیا گیا ہے۔ نیز اس میں شاہ صاحب کے اور ان کے بزرگوں کے خود نوشت سوانح حیات بھی ہیں۔ اس سلسلے میں آپ کی عربی و فارسی کتب کے انتخاب کا اردو ترجمہ دیا گیا ہے۔ یہ کتاب نہ صرف شاہ صاحب کی جلیل القدر علمی شخصیت کا ایک اجمالی تعارف ہے بلکہ آپ کی ضخیم کتابوں کا ماحصل بھی ہے۔ صفحات ۲۰ ۵۔ قیمت ۱۹ روپے

ملنے کا پتہ: ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور